ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

مولانا عبید اللہ سندھی کا دار العلوم دیوبند سے اخراج

پس منظر کے واقعات پر ایک نظر

(دوسری قسط)

مسئلہ تبلیغ،

مذہبی اعتبار سے واحد مسئلہ تبلیغ کا تھا، مولانا سندھی مرحوم کا خیال تھا کہ دعوت اسلام

الف؛ حکمت اور

ب موعظت حسنہ کے ساتھ مشروط ہے اور

ج جدل و بحث کی ضرورت پڑے تو وہ بطریق احسن ہونی چاہیے۔

حکمت و موعظت میں یہ چیز شامل ہے کہ دعوت مخاطبین کی زبان میں دی جائے ان کی ذہنی و دماغی سطح کے مطابق تفصیل یا اجمال اور استدلال یا تمثیل سے کام لیا جائے اور ان کے دل یا دماغ، فکر یا جذبات کو انگیخت کیا جائے۔ ان کی نفسیات کو سمجھ کر انھیں بلایا جائے، ان کی عادات و اطوار، ان کی روایات و رسوم اور تاریخ و تہذیب، جس کی ذہن پر سخت گرفت ہوتی ہے اور ان کی قیود کو انسان کے لیے توڑنا بہت مشکل ہوتا ہے نظر انداز نہ کر دینا چاہیے، اس کے علاوہ پوری دردمندی، دل سوزی، غم گساری اور مخاطبین سے سچی ہمدردی کو بروئے کار لایا جائے۔ یہ مسلمانوں کے فرائض اسلامیہ و شرعیہ ہیں اگر وہ انھیں بجا نہیں لاتے تو اتمام حجت نہیں ہوتا قرآن حکیم کسی پہاڑ یا بے جان و بے حس شے پر نازل نہیں ہوا تھا۔

داعی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) گوشت پوست، احساس و شعور کے مالک انسان تھے آپ میں تمام بہترین

اور بعض انسانی ہنریافتہ موجود تھے۔ انسانیت کے ہمہ دم گزار تھے۔ قرآن حکیم مخاطبین کی زبان میں، ان کے پسندیدہ اور ادب کے دلکش اور معیاری اسلوب میں نازل ہوا تھا۔ داعی اعظم علیہ السلام نے حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا تھا۔ اور موعظہ حسنہ کے تمام شرائط کو پورا فرمایا تھا تو حجت تمام ہوئی تھی حضور نبی کریم علیہ السلام نے عملاً عرب میں اور اصولاً تمام عالم انسانیت میں حجت تمام فرمائی تھی۔ آپ کے بعد آپ وارثین یعنی علماء کرام کو دنیا کی تمام اقوام میں۔ الگ الگ ملکوں میں اور ان کی زبانوں میں، ان زبانوں کے بہترین اسلوبِ تحریر و بیان میں، حالات و وقت کے مطابق، ہر قوم کی تاریخی، تہذیبی، روایات و رسوم کے پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ان کی ذہنی و فکری سطح کے مطابق اجمال یا تفصیل اور استدلال یا تمثیل کے طریق تعلیم و تبلیغ سے کام لے کر حجت تمام کرنی ہے۔

اسلام کے داعی اعظم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے خصائص نبوت ہیں۔

۱۔ قرآن حکیم کی تعلیم دینا۔

۲۔ اللہ کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانا یعنی معرفت الٰہی کی تعلیم دینا۔

۳۔ حکمت کی باتیں سکھانا۔

۴۔ قلوب کا تزکیہ اور باطن کی صفائی کرنا، ذہن و فکر کو جلا دینا، جذبات کی تطہیر کرنا اور باطن میں سعادت و صلح کی تخم ریزی کرنا۔

۵۔ جہالت سے علم کی روشنی میں لانا۔ ان باتوں کو بتانا اور سکھانا جو ان کے لیے نامعلوم اور غیر محسوس ہوں، اس میں آخرت اور غیب کی باتیں، اعمال کے خواص اور نتائج کی طرف توجہ دلانا، تمام باتیں آجاتی ہیں۔ (۲: ۱۲۹ و ۱۵۱)

دعوت و تبلیغ کے سلسلے کی یہ تمام باتیں امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے علماء کے فرائض میں شامل ہیں اب اگر وہ اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں اور انسانیت کے کسی طبقہ و قوم کو دعوت اسلام سے محروم رکھتے ہیں تو اس بات میں تو شک ہے کہ اللہ تعالیٰ محرومین دعوت کو بخشے گا یا نہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے مشیتِ الٰہی ان کے ساتھ کچھ بھی برتاؤ کر سکتی ہے اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے یقین ہے کہ ان میں جس درجے میں تبلیغ ہوئی ہوگی یا نہیں ہوئی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اسی درجے اور اسی قسم کا معاملۂ بخشش و گرفت فرمائے گا لیکن اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ علماء امت دعوت و تبلیغ اسلام، کوتاہی اور اغماض کے مجرم ضرور قرار پائیں گے۔ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ محرومینِ سعادت کو علماء امت کی بے عملی کی سزا

نہیں دے سکتا۔

حکمت و موعظت کے تمام تقاضے پورا کرنا دقت سے داعیانِ کرام کا کام ہے اور قبولیت حق کے لیے مخاطبین کے دلوں کے دروازے کھولنے کا تمام ظاہری سر و ساماں کرنا مبلغین اسلام کا فرض ہے یہاں کے فرائض اسلامیہ شرعیہ میں داخل ہے اگر انھوں نے یہ حجت تمام کر دی تو ان کا فرض ادا ہو گیا لیکن اگر اتمام حجت میں کوئی کمی رہ گئی تو پہلے وہ اس کے لیے جواب دہ ہوں گے۔ بعد میں مخاطبین سے عدم قبولیت کے سبب بازپرس ہوگی۔ قبولیت حق کے لیے دلوں کے دروازوں کا واقعی کھولنا یا نہ کھولنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ قبولیت حق کے لیے داعیوں اور مبلغوں کو ذمہ دار نہیں بنایا گیا ہے۔

دعوتِ اسلام اور تبلیغ حق کی کامل درجے میں اتمام حجت کے بعد بھی اگر مخاطبین دعوتِ اسلام قبول نہ کریں تو وہ اصطلاحِ اسلامی میں "کافر" کہلائیں گے لیکن جن قوموں میں حکمت و موعظت کے قواعد و شرائط کے ساتھ اسلام کی دعوت ہی نہ دی گئی ہو ان پر "انکار" (کفر) کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات عدلِ الٰہی سے بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے "کفر" کی بازپرس کرے۔ یہ کہنا کہ قرآن حکیم نازل ہو گیا۔ اور مجرد یہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی۔ اب اسلام کے قبول و عدم قبول کے لیے دنیا کا ہر انسان اپنے طور پر خود جواب دہ ہے، عقل سے بعید بات ہے۔

اقطارِ عالم میں آج بھی ایسی بہت سی اقوام ہیں، جن تک ابھی علم و تہذیب کی روشنی نہیں پہنچی، وہ جنگلوں، بیابانوں اور پہاڑوں میں تہذیب و معاشرت سے بہت دور اپنے مخصوص گرد و پیش میں فطری زندگی گزار رہی ہیں، خود ہندوستان اور پاکستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں ایسی متعدد اقوام موجود ہیں جو آج تک علم و تہذیب کی روشنی سے محروم اور مذہب و اخلاق کے نام سے ناآشنا ہیں۔ ان سے ان کے کفر کی بازپرس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ اگر دعوت و تبلیغ حکمت و موعظت کی تمام شرائط کے ساتھ مسلمانوں کے علمائے دین کے فرائض میں شامل ہے اور بلاشبہ شامل ہے تو ان سے ان کی عدم ادائیگی فرائض کی بازپرس ضرور ہوگی مسلمان اور خصوصاً علما اپنی بے عملی اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کے سبب ایسی اقوام کو کفر کا الزام نہیں دے سکتے۔

اور جہاں تک دعوت و تبلیغ کے حق کا تعلق ہے، تو وہ تو ہندوستان کی معروف و متمدن اقوام میں بھی حکمت و موعظت حسنہ کی تمام شرائط کے ساتھ ادا نہیں ہوا۔ اسلام کی حقانیت کے اثبات اور فرق و مذاہب

بالکل سے ردیں کچھ لٹریچر چھاپ دینا اور گلی کوچوں اور بازاروں کے مناظروں میں کسی مذہبی مبلغ یا مناظر کو ہرا دینا بہت بڑے اور وسیع میدانِ عمل کے ایک چھوٹے سے گوشے کی بات ہے۔ اگرچہ ایک درجے میں اس کی بھی اہمیت ہے، لیکن اقوام وعوام میں دعوت وتبلیغ کے فریضۂ شرعیہ کی ادائیگی سے بہت دور کی بات ہے۔

جہاں تک دعوت وتبلیغ اسلام کے حق کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کے بعد اس پر توجہ ہی نہیں دی گئی۔ ملکوں کو فتح کیا گیا۔ قوموں پر غلبہ حاصل کیا گیا، مسلمانوں کی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا، لیکن حقِ تبلیغ ودعوتِ اسلام نہ ملکوں کی فتوحات سے اور حکومتوں کے قیام سے پہلے ادا کیا گیا نہ بعد میں اس طرف توجہ دی گئی، بلاشبہ صوفیہ کے مقدس طبقے نے اپنے انداز سے اسلام کی اشاعت میں حصہ لیا، لیکن ان کی تحریک کو بھی مسلمان بادشاہوں، حکمرانوں اور فاتحوں سے کوئی تقویت پہنچی، بلکہ بعض اوقات تو خود خود انھیں مسلمان بادشاہوں اور حاکموں کے ظلم وجور کا نشانہ بننا پڑا۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے تبلیغ کے مسئلے پر ان خیالات کا اظہار کیا تھا تو بالکل صحیح کیا تھا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس ماحول میں وہ تھے وہاں اس مسئلے کو چھیڑنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور ان سے پیشِ نظر جو مقاصدِ مہمہ تھے ان کو اس بحث سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا اور نہ پہنچا بلکہ ان کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا سندھی کے خیالات اور بحث واختلاف کا پتا چلا تو انھوں نے فرمایا کہ مسئلہ وہی ہے لیکن اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ حضرت شیخ الہند کے اظہار وبیان سے بھی مولانا سندھی کے خیالات کی تردید نہیں، تائید ہوتی ہے مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند نے فرمایا:

"انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کس کو کس درجے کی ہوئی ہے، حق تعالیٰ سبحانہٗ ہی اسے جانتے ہیں اور مواخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے ..... اشخاص کو متعین کرکے یہ جاننا آدمی کے لیے ناممکن ہے کہ کس کو کس درجے کی تبلیغ ہوئی۔ اور جب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہوسکتا تو مواخذہ کی تفصیل بھی ہم کیسے کرسکتے ہیں؟"

افادات وملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، از محمد سرور، لاہور، ص ۲۲۲

---

۵ پروفیسر محمد سرور مرحوم نے "افادات وملفوظات" میں حضرت کی تقریر کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ میرے سامنے مولانا گیلانی مرحوم کا اصل مضمون نہیں ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے حضرت کی اس تقریر کو "شستہ و رفتہ" تقریر قرار دیا اور فرمایا ہے کہ:

"آپ (حضرت شیخ الہند) نے ایک ایسی شستہ و رفتہ تقریر میں یہ مسئلہ بیان فرمایا جو بندے کے نزدیک حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے" (ایضاً ص ۳۷۵)

یقین رکھنا چاہیے کہ مولانا سندھی مرحوم نے اپنے محبوب استاد حضرت شیخ الہند کے فکر و منشا کے خلاف یا اس سے زائد ایک حرف نہ کہا ہوگا۔ اور اگر حضرت کا بیان اس باب میں "حرف آخر" کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو مولانا سندھی کے افکار کم از کم دیوبندی مکتبۂ فکر میں حرف آخر ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔

اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی معذرت اور "غلط فہمی" کے اعتراف نے تو قطعی طور پر فیصلہ کر دیا کہ مولانا سندھی کا مسلک ہی حق و صواب تھا۔ مولانا کشمیریؒ کو جوں ہی پتا چلا کہ مولانا سندھی کابل سے روس اور ترکی کے بعد ... پہنچ گئے ہیں، انہیں خط لکھا اور معذرت خواہ ہوئے

حضرت کاشمیری لکھتے ہیں:

"قیام دیوبند کے زمانے میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا اب میرے دل میں کوئی رنج نہیں ہے۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے"۔

اگر یہ مسئلہ کسی درجے میں تھا بھی، تو ایک علمی تھا۔ اسلام کے بنیادی عقائد سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مسئلے میں مخالفین ہی کی رائے کو درست مان لیا جائے۔ تب بھی اسے کفر اور اسلام کی کسوٹی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بات نہایت متقشفانہ اور زیادتی تھی کہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو کافر اور واجب القتل قرار دیا جائے اور صرف اس بنا پر دیوبند سے ان کے تعلق کو منقطع کر دیا جائے۔ لیکن یہ تھا ہی کہاں اسے تو صرف دیوبند سے مولانا سندھی کے اخراج کا بہانہ بنایا گیا تھا۔ حقیقت تو کچھ اور ہی تھی۔ مفتی عزیز الرحمٰن لکھتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ علمی اختلافات تھے تو کیا یہ اختلاف اس قابل تھے کہ ایک سرگرم کارکن کو ضائع کر دیا جائے؟ اور پھر کیا یہ حالات صرف علامہ سندھی کے پیدا کیے ہوئے تھے؟

اگر غور کیا جائے تو اصل تحریک کے محرک اعلیٰ حضرت شیخ الہند تھے لیکن حضرت شیخ الہند سے کون ٹکر لیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ جمعیت الانصار کے پروگرام اور اس کی تجاویز سے جہاں

انگریزوں کو بوکھلاہٹ تھی، وہاں دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے اقتدار پر بھی شدید ضرب واقع ہو رہی تھی۔ جس کے سبب "انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے علامہ سندھی پر علمی اور مذہبی الزامات لگا کر ان کو علاحدہ کر دیا جائے"۔ (تذکرۂ شیخ الہند ص ۱۷۵، ۱۷۶)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ واقعتاً یہ کوئی علمی مسئلہ نہ تھا بلکہ مولانا سندھی کو دیوبند سے نکالنے کے لیے محض ایک چال تھی:

"ارباب اہتمام دارالعلوم دیوبند مولانا سندھی کی ان سرگرمیوں کو اپنے اور دارالعلوم دیوبند کے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھتے تھے اور اس خطرے کو مول لینے کے لیے ارباب اہتمام کسی طرح تیار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے علامہ سندھی کے خلاف چند مسائل کھڑے کیے تاکہ ان کو دارالعلوم سے یہ کہہ کر نکال دیا جائے کہ وہ اکابر کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں یا گمراہ ہو گئے ہیں یا ان کے افکار و نظریات گمراہ کن ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کا دارالعلوم کی چار دیواری میں رکھنا طلبہ کے لیے مضر ہے چنانچہ ارباب اہتمام نے چند مسائل کھڑے کیے اور مولانا کشمیری اور علامہ عثمانی کی ٹکر علامہ سندھی سے کرا دی۔ دیوبند میں ان ہر سہ حضرات کے درمیان مناظرہ ہوا جو حقیقت میں مولانا کے نکالنے کے لیے ایک بہانہ تھا چناں چہ علامہ سندھی کے خلاف ایک ہلڑ بازی کھڑی کر دی گئی اور ان کی پوزیشن کو ملک میں مجروح کرنے کی ناکام کوشش کی گئی"۔ (ص ۱۷۴)۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے ارباب اہتمام دارالعلوم کے بارے میں نہایت حسن ظن سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی انھیں تسلیم کرنا پڑا ہے کہ مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علماء کے درمیان "اختلاف پیدا کیا گیا تھا" نہ کہ واقعی کوئی مسئلہ تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے افکار پر مبنی یہ پورا بیان لاحظ فرمائیں حضرت رح لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے سامنے دارالعلوم کا بقا و تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریز کی پالیسی ان کے سامنے تھی انھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق

اس مرکز سے نہ رہے۔

اس زمانے میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دار العلوم کے دوسرے علما کے درمیان اختلاف پیدا کر دیا گیا۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دار العلوم سے علاحدہ کر دیا گیا۔ چنانچہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

اس اختلاف نے اگرچہ دار العلوم کے اساتذہ، ملازمین اور عام طلبہ کو حضرت مولانا سندھی سے بہت بعید کر دیا تھا لیکن حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہ آیا۔ خفیہ آمد و رفت جاری رہی، رات کے اندھیروں میں دیو بند کے باہر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ضروری ہدایتیں انجام دی جاتی رہیں"۔ (نقش حیات ۲: ۵۶۱، ۵۶۲)۔

نقش حیات ہی میں ایک اور مقام پر حاشیے میں ان مسائل کو "مسائل دینیہ مختلفہ فیہا" تحریر فرمایا ہے اس باب میں ارباب اہتمام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو رعایت برتی جا سکتی تھی یہی تھی کہ مسائل مختلفہ فیہا قرار دے کر انھیں اختلاف کا حق دیا جائے، لیکن یہاں بھی ارباب اہتمام کی زیادتی یہ ہے کہ ان میں مولانا سندھی کو حق رائے و اختلاف دینے کے بجائے ان کی "تضلیل و تکفیر" کرائی گئی۔ اگر یہ مسئلہ واقعی مختلف فیہا تو پھر کی لیکن نہ ان کے رجوع کو قبول کیا نہ توبہ تسلیم ہوئی۔ انھیں نہ صرف مدرسہ سے بے دخل کیا بلکہ دیوبند کی سرزمین کو ان پر تنگ کر دیا اور دیو بند سے انھیں نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ پھر ارباب اہتمام نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ

"حضرت شیخ الہند کے خلاف ریشہ دوانیاں کیں۔ پھر حضرت سے متعلق حکومت کو اطلاعات فراہم کیں، حضرت کی گرفتاری کے لیے حکومت کو مشورہ دیا۔ شمس العلماء مولانا محمد احمد مہتمم دار العلوم نے بہ ذات خود حضرت کے ساتھ دہلی تک کا حضرت کی مخبری کے لیے سفر کیا اور اپنے مرید ڈاکٹر انصاری کی بیوی کے ذریعے جاسوسی کی۔ ڈاکٹر صاحب اور حضرت کی گفتگو کا موضوع اور تفصیلات معلوم کرنے کا اسے ذریعہ بنایا، عبد الاحد نامی ایک شخص کو جاسوسی کے لیے حضرت شیخ کے ساتھ حجاز بھیجا وہ واپس آیا تو حاصل شدہ معلومات سے ڈپٹی کلکٹر سہارن پور کے ذریعے گورنر یوپی کو مطلع کیا، دیو بند کے حالات اور حضرت شیخ الہند کی مصروفیات، مشاغل اور کارگزاریوں کے بارے

میں باغیانہ رپورٹیں دی گئیں اور نہایت مستعدی کے ساتھ انگریز کی وفاداری کا ایک ایک عمل بجالایا گیا۔ ان خدمات کے صلہ میں شمس العلماء کا خطاب پایا۔ نقد انعام، جاگیر اور ماہانہ وظیفہ پایا اور جب محسوس کیا کہ ان انعامات واعزازات کے ساتھ دارالعلوم کا منصب اہتمام خطرے میں پڑ جائے گا اور دارالعلوم کے خاموش ردعمل کا سامنا کرنا بھی مشکل ہوگا۔ تو ریاست حیدرآباد (دکن) میں مفتی اعظم کے منصب پر فائز کر دیے گئے۔ برٹش مفادات کے تحفظ کے تمام اعمال حضرت قاسم العلوم کے قائم کردہ دارالعلوم یا اس "نئے محاذ" میں انجام دیے جانے لگے جو حضرت نانوتوی نے جہاد شاملی کی ناکامی کی تلافی کے لیے قائم کیا تھا۔ اور یہ اعمال نہ صرف ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۵ء تک حضرت شیخ الہند کے زمانہ میں انجام دیے گئے بلکہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے دورتک انجام دیے جاتے رہے۔ دارالعلوم کو نہ صرف یہ کہ ملک کی آزادی سے جدوجہد سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی بلکہ جدوجہد سے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ اسیران مالٹا کی رہائی کی کوششوں میں ارباب اہتمام نے اپنے رویے سے بہت مایوس کیا۔ جب حریت پسند جماعتوں نے اسیران مالٹا کی رہائی کے لیے تحریک چلائی اور ڈاکٹر انصاری نے اپنے سیکریٹری عبدالعلی خان (رامپوری) کو دارالعلوم ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی (پان اسلامک) تحریک چلائے مگر مہتمم اور ارباب شوریٰ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان ہی میں ختم کر دیا۔" (نقش حیات/ ۲ ص ۶۶۰)

اگر واقعی کوئی اسلامی مسئلہ ہوتا یا دارالعلوم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا تو اس طرح بھی خوش اسلوبی سے ساتھ طے ہوسکتا تھا کہ اسے حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ دینی مسئلے کی حیثیت میں حضرت شیخ الہند کا ایک اشارہ مولانا سندھی کے رجوع کے لیے کافی ہوتا۔ اور اگر دیوبند کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا تو حضرت شیخ الہند مدرسہ کے دشمن تو نہیں تھے۔ وہ مدرسہ کے تحفظ اور تحریک کے جاری رکھنے کی بھی کوئی صورت نکال لیتے۔ وہ مولانا سندھی کو منع بھی کر دیتے ان کی جدوجہد کو بعض حدود میں پابند کر دیتے یا جیساکہ بعد میں کیا، ان کے مرکز کو تبدیل کر دیتے! لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ارباب اہتمام نے حضرت شیخ الہند کو اعتماد میں لیے بغیر مولانا سندھی کے خلاف محاذ قائم کیا۔ حضرت ہی کے بعض تلامذہ کو ان کے خلاف استعمال کیا۔

ان کے احتساب کے لیے ایک ایسے دن کا انتظار کیا جب حضرت شیخ الہند دیو بند میں نہ ہوں۔ ان کے بعض خیالات کو کافرانہ اور انھیں واجب القتل قرار دیا۔ مولانا سندھی نے ان خیالات سے رجوع فرما لیا، تھا تو اس میں اختلاف باعث تفضیل و تکفیر کیوں کر ہو سکتا ہے اس لیے حضرت شیخ الاسلام نے اس تفضیل و تکفیر اور دیو بند سے مولانا سندھی کے اخراج کی اصل وجہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اصل وجہ سیاسی تھی۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"..... بعض مسائل دینیہ مختلف فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دو بلند پایہ معاصرین کو بدظن کر کے تضلیل و تکفیر پر آمادہ کیا گیا اور اسی اختلاف کی بنیاد پر مولانا سندھیؒ کو دیو بند سے الگ کیا گیا۔ ان میں سے ایک بزرگ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چناں چہ انھوں نے مولانا سندھی سے معافی مانگی۔ بہر حال اصل سبب (مولانا سندھی کے اخراج کا) وہ امر ہے جس کی بنا پر مسٹن گورنر یو پی دیو بند اور دار العلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔" (ایضاً/۲، ص ۱۶۶ حاشیہ)

حضرت شیخ الاسلام یہ حاشیہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے اس فقرے پر تھا کہ:

"عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیو بند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعے کا تعاون حاصل کرے اور میمورنڈم پر دستخط کرانے کے لیے بھیجا تو نہ صرف لیت و لعل سے کام لیا بلکہ ایک ہفتہ انتظار کرانے کے بعد خان صاحب کو مایوس لوٹا دیا۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں ارباب اہتمام خود ایک وفد لے کر ہز آنر گورنر یو پی کے حضور باریاب ہوئے اور حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کی رہائی کے لیے عرض پرداز ہوئے لیکن اس وقت جب گورنر کا ایما اس سلسلے میں معلوم کر لیا تھا پھر بھی کیا ان کی چاپلوسی اور خوشامد پسند سیرتوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے حضرت اور آپ کے رفقا کی رہائی کا مطالبہ کیا ہو گا؟ خوشامد پسند زبانوں پر جو بات اس موقع پر آئی ہو گی وہ اس سے زیادہ نہ ہو گی کہ حضور! سیاسی جماعتیں، مذہبی انجمنیں، دینی ادارے، عوام، ہندو، مسلمان محمود حسن کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں، صوبے کی لیجسلیٹو اسمبلی، وائسرائے کی کونسل میں سوالات کیے جا رہے ہیں۔ خود دار العلوم میں بے چینی بڑھ رہی ہے اور حضور کے وفاداروں کی مشکلات

میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ اس لیے ان کی قید و نظر بندی پر ضرور ہمدردانہ غور فرمائیں اور مراحم خسروانہ سے کام لے کر ان کو رہا فرما دیں ۔ شاید یہ بھی کہا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ میں عظیم برطانیہ کو فتح یاب فرمایا ، ترکی کو اس کی خودسری کی سزا مل گئی ، اس کے مسے بخرے ہو گئے مختلف معاہدات میں اسے جکڑ دیا گیا ۔ جب ترکی کے کس بل نکل گئے ہیں تو اس کے حامی اور ہمدرد محمود حسن جیسے لوگ گریٹ برٹش ایمپائر کا کیا بگاڑ سکتے ہیں !

جیسا کہ عرض کیا ، اگر یہ مسئلہ واقعی مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے عقیدے یا کسی مسئلے میں ان کی رائے اور تحقیق کی غلطی کا تھا تو اس کا راست اور بہترین طریقہ یہی تھا کہ حضرت شیخ الہند کے سامنے مسئلہ پیش کر دیا جاتا ۔ حضرت کا ایک اشارہ مولانا سندھی کے رجوع کے لیے کافی ہوتا لیکن ارباب اہتمام کو خود بھی یقین تھا کہ مسئلہ وہ نہیں ہے جو وہ لوگوں میں مولانا سندھی کے خلاف اشتعال پھیلانے کے لیے بیان کرتے ہیں ۔ انھیں یقیناً اندازہ ہو گا کہ حضرت شیخ الہند کی رائے بھی مولانا سندھی کی رائے سے زیادہ مختلف نہ ہو گی ۔ اس لیے اس مسئلے میں حضرت سے رجوع نہیں کیا گیا ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ درس کے دوران میں اس سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں حضرت نے ایک کافی و شافی تقریر فرمائی تھی اور وہ سب مطمئن ہو گئے تھے ۔ مولانا سندھی بھی حضرت کے ارشادات عالیہ سے یقیناً مطمئن ہو جاتے لیکن معلوم ہے کہ ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی ۔ پھر جہاں روایت یہ ہو کہ دارالافتا سے جاری ہونے والے فتووں پر شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین کے بھی دستخط ہوتے ہوں ، وہاں دارالعلوم کے ایک فاضل اور خود صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث کے ایک شاگرد رشید کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا تھا اور نا موراستاد کو اس سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا ۔ لیکن یہ سب تو تب ہوتا جب واقعی دارالعلوم کی بقا اور اس کے تحفظ کا یا کوئی علمی مسئلہ ہوتا ۔ وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا اور طے کر لیا گیا تھا کہ عبیداللہ سندھی کو بہ ہر صورت دیوبند سے نکالنا ہے ۔ مولانا سید اسعد مدنی نے لکھا ہے :-

" اگر عقیدے اور دین کی بات ہوتی تو اس مباحثے میں حضرت شیخ الہند کو جو شیخ الحدیث ، استاذ الکل اور حضرت نانوتوی کے جانشین اور ان کی (علمی و فکری) امانتوں کے صحیح امین تھے ضرور شریک کیا گیا ہوتا ۔ ان کا ایک اشارہ مولانا سندھی کے رجوع کے لیے کافی ہوتا مگر یہ علمی بحث و مباحثہ محض دکھانے کے لیے تھا اصل سازش تو انگریز کی تھی "

(ایک خود ساختہ داستان ۔ حقائق کے آئینے میں ، ص ۱۴ ، ۱۵)

اس سے آگے مولانا اسعد مدنی لکھتے ہیں :

"سچی بات تو یہی ہے کہ مولانا سندھی کے ساتھ ارباب اہتمام نے جو کچھ کیا، وہ انہی جرم بے گناہی کی سزا کے طور پر جس کا بیج ان کے اندر خود حضرت شیخ الہند نے پیدا کیا تھا۔ یعنی انگریز دشمنی، جسے ارباب اہتمام ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھے لیکن براہ راست اس پر ایکشن لینے میں بہت سے خطرات تھے اور سب سے بڑا خطرہ تو خود حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی تھی۔ اس لیے ایک علمی مسئلے کا شاخسانہ بظاہر کھڑا کرکے اس کی آڑ میں مظلوم حضرت سندھی کو ہٹایا گیا۔" (ایضاً ص ۱۵، ۱۶)

اگر مسئلہ واقعی مولانا سندھی کے کسی فاسد عقیدے اور دیوبند کے مسلک و مشرب سے انحراف اور اس کے ترک کا ہوتا تو حضرت شیخ الہند سے مشورہ نہ کیے جانے کے باوجود حضرت کے علم میں یہ بات آتی تو وہ مولانا سندھی سے خود بات کرتے۔ ان کے خیالات سے رجوع کرواتے، توبہ کرواتے اور اگر مولانا سندھی ایسا نہ کرتے تو حضرت شیخ الہند کی غیرت ایمانی یہ بات کب گوارا کرسکتی تھی کہ ایسے شخص سے وہ نصرت و حمایت اور مودت و محبت کا تعلق رکھتے! اس کے برعکس حضرت شیخ کے رویے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا سندھی سے نہیں بلکہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ سے جو مولانا سندھی سے اختلاف میں پیش پیش حضرات میں سے ایک تھے، بیزاری کا اظہار کیا تھا اور ان کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ مولانا اسعد مدنی لکھتے ہیں :

"اس کارروائی سے حضرت شیخ الہند کو کس قدر اذیت پہنچی تھی اور اس سے وہ کس درجہ متاثر ہوئے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ اس کارروائی کے عمل میں آنے کے بعد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ جن سے مولانا سندھی کی تکفیر کے فتوے پر دستخط لیا گیا تھا حضرت شیخ الہند کی مجلس میں پہنچے تو حضرت نے ان کی جانب سے رخ پھیر لیا۔ بعد میں منت سماجت کے بعد ان سے راضی ہوئے۔ اگر یہ کارروائی واقعی شرعی نقطۂ نظر کے مطابق تھی اور دین کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی تو اس سے حضرت شیخ الہند کی ناراضگی و ناگواری کی کیا توجیہ ہوگی؟" (ایضاً ص ۱۶)

(جاری ہے)